# اِسلامی دُنیا کا ایک ماہر نفسیات

## امام غزالی اور میک ڈاوگل کا تقابلی مطالعہ

(از مولانا عبدالمالک صاحب آروی)

اسلامی ادبیات میں نفسیات کے اصول وضوابط کا کافی ذخیرہ پایا جاتا ہے، ہرچند علمائے مغرب طرح علمائے اسلام نے نفسیات پر کوئی مستقل تصنیف نہیں چھوڑی لیکن اسلام کا فلسفۂ اخلاق، اور فلسفۂ صوف نفسیات ہی پر مبنی ہے، اس لیے صوفی ادب کا اخلاق وحکم ثانوی حیثیت سے بالکل نفسیاتی چیز ، سنائی وعطار، رومی وابن عربی، طوسی وغزالی اگر ایک طرف اکابر صوفیہ اور صوفی شعراء تھے تو سری طرف وہ نفسیات کے ماہر بھی تھے، چنانچہ اس مقالہ میں صرف امام غزالی کی نفسیات سے بحث جاتی ہے۔

اخلاق ناصری، اخلاقِ جلالی، اور احیاء العلوم نہ صرف فلسفۂ اخلاق کی کتابیں ہیں بلکہ ان اندر نفسیات کے سیکڑوں رموز ونکات پیش کیے گئے ہیں، آپ غزالی کا گہرا مطالعہ کرینگے تو نتیجہ پر پہنچینگے کہ ریبو، شیلنڈ، جیمس اور میک ڈاوگل نے نفسیات کے متعلق خالص مادی رنگ جو عقدہ کشائی کی ہے۔ امام غزالی نے اس کو دینیات واخلاقیات میں پیش کر دیا ہے۔

آپ "کیمیائے سعادت" کی مہلکات اور منجیات کی بحثیں پڑھیے آپ اس نتیجہ پر پہنچینگے کہ چودھویں صدی ہجری میں جو کچھ کہا جارہا ہے وہ اواخر پانچویں صدی میں کہا جاچکا ہے یوں غرب کو اب اعتراف ہے کہ مشرق سے اس نے بہت کچھ سیکھا، دوسرے ائمۂ اسلام کی طرح

امام غزالی کی کتابیں بھی لاطینی تراجم کے ذریعہ یورپ کی درسگاہوں میں پہنچیں، لیکن ابھی اکتشافات تکمیل نہیں ہوئی۔ جیوں جیوں تاریخی حقائق سامنے آتے جاتے ہیں اور انسانی مطالعہ میں وسعت ہوتی جاتی ہے، نئے نئے شواہد نظر کے سامنے آرہے ہیں۔

اس مضمون میں ہم پہلے امام غزالیؒ اور میک ڈاؤگل کی زندگی سے بحث کرینگے اور اس کے بعد آخرالذکر کی معرکۃ الآرا کتاب "مقدمہ نفسیات اجتماع" پر ایک نظر ڈالینگے، اور اس کے نفسیاتی اکتشافات پر مجمل بحث کرتے ہوئے امام عالیمقام سے اس کا موازنہ کرینگے۔ اور ضمنی طور پر ریبو، شیلنڈ اور جیمس کے نظریات پر بھی ایک نظر ڈالینگے۔

## امام غزالی کی زندگی اور فلسفہ پر عمومی نظر

امام کی زندگی کا قصہ عجیب ہے[1]۔ ان کی تصنیفات کی اثر آفرینیوں کا ادراک کرنے کے لئے ان کی زندگی پر کسی قدر مفصل بحث کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ آپ ۱۰۵۹ء میں خراسان کے ایک شہر طوس میں پیدا ہوئے۔ آپ شاعر اجل فردوسی کے ہموطن ہیں اور جس طرح فردوسی ایرانی قوم کی قدیم شان و شکوہ کا ثبوت پیش کرتا ہے، اسی طرح امام غزالی کی قسمت میں لکھا جا چکا تھا کہ آپ مستقبل اسلام کے لیے شہادت اور زیور ہوں[2]۔ آپ کی ابتدائی تعلیم آپ کے والد کی وفات کے بعد ایک صوفی دوست کے گھر پر ہوئی یہ تعلیم اس کے لحاظ سے قومی کی بہ نسبت عالمگیر زیادہ تھی، کوئی حد بندی

---

[1] امام غزالی کے حالات اور فلسفہ پر تنقیدی معلومات ڈاکٹر ٹی۔ جے بوئیر کی کتاب "تاریخ فلسفہ اسلام" سے لیے گئے یہ کتاب جرمنی میں لکھی گئی ۱۹۰۳ء میں ایڈوارڈ۔ آر۔ جونس۔ بی۔ ڈی نے انگریزی میں ترجمہ کیا اس ترجمہ کا دوسرا ایڈیشن میں نکلا یہی میرے پیش نظر ہے اور اسی سے استفادہ کیا گیا ہے۔ (ع۔م)

[2] "غزالی" کی وجہ تسمیہ کے متعلق مختلف علماء و مصنفین نے مختلف روایتیں لکھی ہیں بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ "غزال" کی طرف منسوب ہے، جیسا کہ اہل خوارزم اور جرجان کی عادت ہے، اور وہ قصار سے قصاری اور عطار سے عطاری بناتے ہیں۔ بعض روایات یہ ہیں کہ غزالی میں "ز" مخففہ ہے، اور یہ منسوب ہے غزالہ کی طرف جو طوس کے (بقیہ بر صفحہ ۲۴۷)

وں کی مضطرب اور تخئیلی روح کے لیے ناگوار تھی۔ اس لیے معلمین اخلاق کے بال کی کھال نکالنے سے ان کو راحت وچین نہ ملا۔ اُنہوں نے اس کو بھی دنیوی علم سمجھا جس سے اُنہوں نے مُنہ موڑ لیا تاکہ معرفت میں اپنی روح کو غرق کردیں۔ آپ نے نیشاپور میں امام الحرمین (متوفی ۱۰۸۵ء) سے الٰہیات تحصیل کی اور اسی وقت سے اُنہوں نے تصنیف وتدریس کا آغاز کیا ہوگا اور غالباً اُس وقت سے ہو اپنے علم کی طرف سے شک وشبہ پیدا ہونا شروع ہوگیا ہوگا، اس کے بعد وہ سلجوقی سلطان کے وزیر نظام الملک کے دربار سے وابستہ ہوگئے یہاں تک کہ ۱۰۹۱ء میں بغداد میں پروفیسر ہوگئے۔ غالباً یہی ہے جبکہ وہ بہت زیادہ فلسفہ کی طرف مشغول رہے، لیکن ان کی یہ مشغولیت علم کی خالص محبت کا نتیجہ جس نے فلسفہ کے مطالعہ کی طرف متوجہ کردیا۔ بلکہ آپ کا مقصود یہ تھا کہ اس کے ذریعہ ان شکوک و ت کے حل کا پتہ لگائیں جو ان کی فکر وادراک کی راہ میں حائل تھے، اس سے نہ تو آپ کا یہ مقصد تھا کہ ث زمان کی تفسیر کریں اور نہ یہ غرض تھی کہ اپنے تخیل کی صفائی کریں، بلکہ مقصود یہ تھا کہ فلسفہ کے ذریعہ ن سکون اور ایک ارفع حقیقت کا تجربہ حاصل کریں۔ انہوں نے فلاسفہ بالخصوص فارابی اور سینا کی تحریروں کا غائر مطالعہ شروع کیا اور ابو علی سینا کے نظام فلسفہ کا تتبع کرتے ہوئے اُنہوں نے کتاب "خلاصہ فلسفہ" تصنیف کی، پہلے تو اُنہوں نے خود اپنے دماغ کے سکون کے لیے بطور تی کہا اور پھر اپنی وکالت میں کھُلم کھُلا یہ اظہار خیال کیا کہ ان کی غرض اس کتاب کے لکھنے سے

نوٹ ۲۴۶) گاؤنوں میں سے ایک گاؤں ہے۔ ابن خلکان نے دونوں روایتیں نقل کرکے لکھا ہے کہ آخرالذکر وجہ تسمیہ روایت کے مخالف ہے، لیکن سمعانی نے کتاب الانساب میں یہی لکھا ہے۔ (وفیات الاعیان جلد ا ص ۲۸)

سمعانی کی کتاب کا ایک نہایت ہی مستند اور عمدہ نسخہ ندوۃ المصنفین دہلی میں ہے۔ مارگولیتھ نے متحف بریطانیہ کے ی نسخہ کا فوٹو لے کر یہ کتاب شائع کی ہے، سمعانی نے ۵۶۲ھ میں وفات پائی اور غزالیؒ کی وفات ۵۰۵ھ میں ہوئی۔ یے ظاہر ہے کہ کتاب الانساب سمعانی میں ان کا تذکرہ ہونا چاہیے تھا لیکن تعجب ہے کہ مارگولیتھ کے نسخہ میں "الغزال" ت دو آدمیوں کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔ (۱) ابوبکر عبد ربہ بن سرحان السعدی الغزال من اہل البصرہ۔ (۲) ابوالفرج د بن الحسین الغزال۔ غزالی کا کوئی ذکر نہیں۔ حالانکہ ابن خلکان نے اپنی روایت میں سمعانی کا حوالہ دیا ہے۔ (ع۔م)

یہ ہے کہ عقائد فلسفہ کی تنقیح کے بعد ان کی پیروی کریں، اور غالباً آپ کی وہ تردید و تنقیح کو شائع ہونے میں زیادہ دیر نہ لگی، یہ مشہور کتاب تہافتہ الفلاسفہ (فلسفیوں کی تباہی) تھی جو آپ نے غالباً قیام بغداد کے زمانہ میں یا یہاں سے جانے کے بعد فوراً ہی تصنیف کی۔

لیکن چار سال کے اختتام کے بعد ۱۰۹۵ء میں غزالی نے بغداد میں درس و تدریس کا کام ترک کر دیا، گو ان کا یہ مشغلہ ظاہری طور پر بہت کامیاب تھا۔ آپ کے ذہن کو جو ایک مسلسل ارتیاب کا شکار رہتا ان مذہبی مسائل سے غالباً سکون نہ ملتا تھا، ان کو اپنی ذات اور ذہن پر اعتماد تھا انہوں نے خیال کرنا شروع کیا کہ دنیا اور اس کی خردمندی سے ایک دوسرے پیرایہ میں ایک بلند تر مقصد کے لیے معرکہ کرنا چاہیے، ان کا حوصلہ اس دنیا کی طلب و داعیہ سے بہت زیادہ بلند تھا، ان کے تفکر میں گہرائی آتی گئی یہاں تک کہ اپنی ایک بیماری کے سلسلہ میں ان کی رُوح کے سامنے داعیۂ باطنی کا ظہور ہوا پوشیدہ طور پر ان کو صوفیانہ ریاضتوں کے ذریعہ اس کام کی تیاری کرنی پڑی، آپ کا غالباً کام یہ تھا کہ ایک مذہبی سیاسی مصلح کا رویہ اختیار کریں۔ ٹھیک اسی وقت جبکہ مغرب میں اسلام کے خلاف محاربات صلیبیہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں، غزالی خود کو دین اسلام کا روحانی قائد بنانے کی تیاری کر رہے تھے، ان کی اصلاح و ترقی کی نوعیت سینٹ آگسٹائن کی طرح جابرانہ حیثیت نہیں رکھتی تھی، بلکہ اس کا موازنہ "سینٹ جیروم" کے تجربہ سے کیا جا سکتا ہے، جس کو ایک خواب میں سسرو کے افکار و آراء سے ہٹا کر عملی مسیحیت کی دعوت دی گئی۔

دس سال تک غزالی یہاں وہاں سفر کرتے رہے اپنا وقت اُنھوں نے دو حصہ میں تقسیم کر رکھا تھا ایک حصہ تو زاہدانہ ریاضتوں کے لیے وقف تھا اور دوسرا علمی تصنیفات کے لیے، اس زمانہ کے اولین حصہ میں اُنھوں نے اپنی خاص الٰہیاتی اور اخلاقی کتاب "احیاء العلوم الدینیہ" لکھی، آخری حصہ میں انہوں نے ایک قائد اصلاح کی حیثیت سے اثر ڈالنے کی کوشش کی، وہ سفر کرتے ہوئے دمشق کی راہ سے

ت المقدس گئے قبل اس کے کہ اس پر صلیبیوں کا قبضہ ہو یہاں سے اسکندریہ، مکہ، اور مدینہ ہوتے ہوئے
نے وطن لوٹ آئے، مراجعت سفر کے بعد ایک بار پھر غزالی نے نیشاپور میں مجلس تدریس قائم کی، اور ۱۹ دسمبر
سنہ ۱۱۱۱ء میں اپنے مرزبوم طوس میں رحلت کی[1]۔ ان کی زندگی کے آخری ایام خصوصیت کے ساتھ زاہدانہ
قبوں اور مطالعۂ حدیث میں صرف ہوتے تھے، جوانی کے عالم میں حدیثیں ان کو یاد نہیں ہوتی تھیں
ب کی زندگی نہایت خوبصورت مکمل اور مدور تھی، جس کا انجام اغاز سے مل جاتا ہے۔

غزالی بادی النظر میں اپنے زمانہ کے روحانی رجحانات سے گذرے ہیں، یہ رجحانات حسب
یل ہیں:-

کلام، تصوف، نیشاغورس کا مشہور فلسفہ، اور اشراقیوں کا فلسفۂ ارسطو۔ متکلمین جو کچھ قائم
چاہتے ہیں وہی ان کی بھی دینی غرض ہے، لیکن اس جماعت کے دلائل ان کے نزدیک کمزور،
ان کے بہت سے دعاوی قابلِ اعتراض ہیں، ان کو تصوف کے ساتھ خاص ہمدردی ہے۔
ن کا عزیز ترین سرمایہ ہے، یہاں ان کا دین و ایمان شخصیت میں مل جاتا ہے، اس طور سے جب
ہ تجربۂ باطن کی بنا پر وہ اسی حقیقت تک پہنچتے ہیں جہاں متکلمین اپنے منطقیانہ طریق استدلال کے ذریعہ
نے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ فلسفۂ عمومی خاص کر ریاضی کے افادات کے بھی مشکور ہیں۔ ریاضی کو
ں کے فلکیاتی ثمرات کے ساتھ وہ پوری طرح سے علم و حکمت سمجھتے ہیں، وہ طبیعات کے جواز کے بھی قائل
ں جہاں دینی عقائد سے معارضہ نہ ہو، لیکن فلسفہ ارسطو جس کی تعلیم فارابی اور ابن سینا نے دی ہے اور جس
سند و اعتبار کا ذریعہ وہی ہے جو علمائے دین پیش کرتے ہیں، ان کے نزدیک اسلام کا دشمن ہے، اور تمام
م اسکولوں اور فکری رجحانات کے نام پر مجموعی طور سے وہ اس سے معرکہ کرنا فرض سمجھتے ہیں، اور
جت یہ ہے کہ وہ یہ کرتے ہیں اور خود ارسطو کے اسلحہ یعنی منطق سے، اس لیے کہ ان کی نظر میں منطق

---

[1] ابن خلکان کی روایت ہے طابران میں دفن ہوئے۔ (وفیات الاعیان جلد ۱ ص ۲۸)

خیالات کے حقائق پر اسی طرح روشنی ڈالتی ہے جس طرح مسائل ریاضیہ کے مسلمات ہیں۔ وہ مسئلۂ تضاد سے ابتدا کرتے ہیں، جس کے سامنے ان کی بحث وجدل کے ماتحت خدا بھی مطیع ومنقاد نظر آتا ہے، وہ فلسفہ کی طبیعاتی، مابعد الطبعی تعلیمات خاص کر تین عقائد پر حملہ کرتے ہیں (۱) یہ کہ عالم ابدی ہے (۲) یہ کہ خدا صرف کائنات کا خبر گیراں ہے اور اس سبب سے کوئی خاص پروردگار نہیں ہے۔ (۳) یہ کہ صرف روح غیر فانی ہے اور اس لیے حشر اجساد نہ ہوگا۔ ان عقائد کی تردید کرنے میں غزالی نے بہتیرے اعتبارات سے ارسطو کے مسیحی شارحین سے استفادہ کیا ہے، مثلاً جوہنس فیلاپولس نے بھی عالم کے عقیدۂ ابدیت کے خلاف لکھا ہے جس کا فرا قلوس کو ادعا ہے۔

فلاسفہ کے نظریہ کے مطابق عالم ایک کرہ کی حیثیت رکھتا ہے جس کی وسعت محدود اور جس کی پائیدار لازوال ہے، ازل سے یہ خدا کی ذات سے نکلا ہے، معلول کی حیثیت سے بھی اور اس کا وجود اسی وقت سے ہے جب سے علت کا، لیکن اس کے برعکس غزالی کی رائے ہے کہ مکان وزمان کے تخیلات پر ایسی مختلف عمارتیں نہیں کھڑی کی جاسکتیں، ان کا عقیدہ ہے کہ کوایک آزاد تخلیقی قوت سے تعبیر کرنی چاہیے۔

**زمان ومکان** غزالی کا خیال ہے کہ ہم لوگ جس طرح زمان کے آغاز وانجام کا تصور نہیں کرسکتے۔ اسی طرح مکان کے خارجی حدود کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ جو لوگ ایک غیر مختتم زمان کا عقیدہ رکھتے ہیں ان کو اپنے خیال وعقیدہ کے مطابق ایک غیر محدود مکان کا وجود بھی ماننا پڑیگا۔ یہ کہنا کہ مکان حسن خارجی کا ثبوت پیش کرتا ہے، اور دوسری طرح زمان باطنی چیز ہے۔ اس نظریہ میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا کرتا، کیونکہ ہم لوگ کبھی حسیات سے آزاد نہیں ہوسکتے۔ جس طرح مکان جسمانیات سے علاقہ رکھتا ہے اسی طرح زمان جسمانیات کی حرکت سے متعلق ہے، دونوں محض اشیا کے رابطے ہیں جن کی تخلیق اشیائے عالم کے اندر ادراک کے ساتھ ہوئی ہے۔ بلکہ یہ ہمارے تصورات کے رابطے ہیں، جن کی خدائے تعالیٰ ہمارے اندر تخلیق کرتا ہے۔

**علت ومعلول** امام غزالیؒ نے علت ومعلول کے متعلق جو کچھ اظہار خیال کیا ہے وہ اور اہمیت رکھتا ہے، فلاسفہ خدا، ملائکہ (جن کے اندر ارادہ ودیعت کیا گیا ہے) روح، قدرت، حدوث اور اسی قسم کی چیزوں کے افعال پر امتیاز کرتے ہیں، لیکن متکلمین کی طرح امام صاحب کا بھی عقیدہ ہے کہ علت ومعلول پیداوار ہے ایک ارادہ رکھنے والی ذات کی، وہ قطعی طور پر فطرت کے علت ومعلول کا رد کرتے ہیں، فطرت ہے کیا؟ محض زمان کا ربط وسلسلہ ہم ایک خاص معلول کو ایک خاص علت کی وجہ سے ہمیشہ ظہور پذیر ہوتے دیکھتے ہیں، لیکن کس طرح سے معلول علت سے منتج ہوتا ہے یہ ہمارے لیے ایک عقدہ ہے، اشیائے قدرت کے فعل عمل کے متعلق ہم کچھ نہیں جانتے، اس کے علاوہ کوئی تغیر بذات خود ناقابل ادراک ہے، یہ کہ کسی شئے کا مختلف چیز بن جانا ہمارے خیال کے لیے ناقابلِ ادراک ہے، ایسی صورت میں خیال کی طرف سے علل کی طرح واقعات کے متعلق سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ کسی شئے کا یا تو وجود ہے یا وجود نہیں ہے، لیکن صورتِ الٰہی بھی ایک وجود بالذات کو دوسری شئے میں تبدیل نہیں کر سکتی، خالق کا کام پیدا کرنا ہے یا فنا ڈالنا۔ پھر یہ ہمارے شعور کا واقعہ ہے کہ ہم لوگ بعض شئے کو معلول مان لیتے ہیں، اگر ہم لوگ کسی شئے کا ارادہ کریں اور اس کو پورا کرنے کی طاقت رکھیں تو اس نتیجہ کو ہم اپنے فعل سے تعبیر کرتے ہیں، ایک آزاد ارادہ کے ماتحت صرف فعل کے سرزد ہونے اور استعمال طاقت کے شعور کو ہم علت ومعلول کہتے ہیں۔ اور اسی کے ذریعہ ہم ذاتِ باری سے بحث کرتے ہیں، لیکن کس حق کے ماتحت؟ اس نتیجہ پر پہنچنے کے لیے امام صاحب کے خیال میں انسان کی رہنمائی اپنے نفس کے اندر خدا کی تصویر کے ذاتی تجربہ سے ہوتی ہے، دوسری طرف وہ فطرت کو خدا کی مثل ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ کیونکہ خدا کا علاقہ خود ان کے نفس سے ہے۔

اسی طرح ان کے نزدیک خدا (جہاں تک اس کا علم دنیا کے ذریعہ ہو سکتا ہے) قدرت والا ہے، ارادہ میں آزاد اور فعل میں مختار ہے، اس کی عملیات سببیہ کے لیے کسی خاص حد کا تعین نہیں کر سکتے، فلاسفہ کے یہاں تعین پایا جاتا ہے، کیونکہ وہ خدا کا اثر صرف اس کی اولین مخلوق شئے میں مانتے ہیں۔

مکان و زمان دونوں میں وہ اپنے فعل کی حد بندی کر سکتا ہے، اس لیے اس عالم فانی کا قرار بھی فانی ہے، فلاسفہ کے نزدیک یہ نظریہ کہ خدا اپنے ہمہ گیر تخلیقی فعل کے ذریعہ عالم کو عدم سے وجود میں لایا بالکل مہمل ہے، وہ ایک مادہ میں حوادث یا صور کا صرف تبادلہ مانتے ہیں، یعنی ایک امکان سے دوسرے امکان میں حقیقت کا منتقل ہونا، لیکن اس صورت میں تو کوئی جدید شئے معرض وجود میں نہیں آتی؟ غزالی سوال کرتے ہیں "کیا محسوسات کا ہر ادراک اور ہر روحانی تخیل بالکل نئی چیز نہیں؟ جس کا خواہ وجود ہو یا نہ ہو لیکن جس کے حدوث کے سبب اس کا مخالف معدوم ہو جاتا ہے، اور جس کے معدوم ہونے سے مخالف وجود میں نہیں آتا، اس کے بعد ان انفرادی روحوں پر غور و فکر کرنی چاہیے۔ جو نظام ابن سینا کے مطابق معرض وجود میں ہونگے، کیا وہ اپنے وجود کے اعتبار سے بالکل حادث نہیں؟

سوالات کی بھرمار ہے، ان کا سلسلہ ختم ہی نہیں ہوتا، اصل موضوع مختلف سمت میں بھٹکا پھرتا ہے، اور تسلسل خیال کی ہنگامہ زائیاں ہیں، مکان و زمان کی طرح علت و معلوم کا سلسلہ ختم نہیں ہو سکتا اس لیے ایک مقرر آخری وجود لازم آتا ہے، اور یہاں پہنچ کر امام صاحب فلاسفہ کے ہمنوا ہو جاتے ہیں۔ یہ کہ ہم کو ایک علتِ غائی کی حیثیت سے ارادۂ ازل کی ضرورت ہے جو تمام دوسری اشیاء سے متاثر ہو۔

بہر حال ہمیں امام غزالی کا رہونِ منت ہونا چاہیے کہ ان کی تنقید کی بدولت ابن سینا کی صور و ارواح کا فرضی عقیدہ رد ہو جاتا ہے۔

اب ہم تصور باری کے مسئلہ تک پہنچتے ہیں، فلاسفہ کے نظریہ کے مطابق خدا ایک ارفع ہستی ہے اور خیال اس کا جوہر ہے، جو کچھ اس کا علم ہے وہ معرض وجود میں ہے، لیکن اس نے اس کا ارادہ نہیں کیا، کیونکہ ارادہ کرنے سے نقص لازم آتا ہے، یعنی ایک حاجت جو مشروط ہے ارادہ کرنے والی ہستی کے تغیر پر — ارادہ کرنا تعبیر ہے مادہ کے اندر حرکت سے مکمل حقیقی روح کسی شئے کا ارادہ نہیں کرتی، اس لیے تصور میں خدا اپنی تکوین کا مشاہدہ کرتا ہے، یہ تصور کسی آرزو سے بالکل پاک ہوتا ہے، و

...ہی ذات بلکہ اولیں مخلوق کو پہچانتا ہے، اس اولیں مخلوق کو ابن سینا اپنی اصطلاح میں تمام اشیاء کے ...دیاس انواع کا کائناتی اور ابدی مرکز کہہ سکتے ہیں۔

لیکن امام غزالی کے نظریہ میں خدا کے ساتھ اس کے صفات ازلی کی طرح "ارادہ" کا تعلق بھی ...لم ہے۔ یہ سچ ہے کہ رسمی طور پر وہ تسلیم کرتے ہیں کہ مابعد الطبیعاتی اور اخلاقی غور وخوض میں جاننے ...علم ووقوف) سے پہلے "ارادہ" کرنا لازمی ہے، لیکن ان کا یقین ہے کہ وحدت ہستی کے لیے نہ تو ...م ووقوف میں استعرار ہے اور نہ ارادہ میں، نہ صرف اشیاء علم ووقوف کی بہتات اور وقوف پیدا ...نے والی ذات کے ساتھ ان کے مختلف علاقے، بلکہ شعور ذاتی یا "جاننے" کے متعلق "جاننا" ایک غیر ...تم سلسلہ ہے۔ ایک فعل ارادی اس کو انجام تک پہنچانے کے لیے لازمی ہے، توجہ مبذول کرنے، ...اپنی ذات سے ہم سخن ہونے میں ایک اصل "ارادہ" برسر عمل رہتا ہے اور اس طور سے خدا کا علم ووقوف ...ں انجام کے اعتبار سے ایک اصل ازلی ارادہ کے ذریعہ اس کی شخصیت میں ایک وحدت چسپاں ...حیثیت رکھتا ہے، فلاسفہ کے اس ادعا کی جگہ کہ خدا عالم کا ارادہ کرتا ہے، کیونکہ وہ اس کو سب سے اچھا خیال ...ہے، امام غزالی یہ اظہار رائے کرتے ہیں "خدا عالم کی واقفیت رکھتا ہے کیونکہ وہ اس کا ارادہ کرتا ہے ...یا اس کے لیے جو ارادہ کرتا ہے اور سب کو پیدا کرتا ہے اپنے کام اور اس کے مادہ کے کمترین حصہ ...ـ کی واقفیت رکھنی ضروری نہیں؟ جس طرح اس کا ازلی ارادہ تمام انفرادی اشیاء کی علت ہے، اسی ...ح اس کا علم ووقوف بہ یک وقت ہر مخصوص شئے کو محیط ہے، اور اس وجہ سے اس کی خصوصیت ...رت کو نقص لازم نہیں آتا لہذا ایک پروردگار ہے۔

اس اعتراض پر کہ خدا کی پروردگاری ہر مخصوص حدوث کو ایک لازمی حدوث بتاتی ہے، ...غزالی سینٹ اگسٹائن کی طرح جواب دیتے ہیں کہ یہ سابق علم اس علم سے جو حافظہ میں ہے ممتاز نہیں ...یہ کہ خدا کا علم ووقوف زمان کے ہر اعتبار سے ارفع ہے۔

سوال ہوسکتا ہے کہ امام غزالی ایک ازلی، قادرِ مطلق، تخلیقی مشیت (ارادہ) کو بچانے کے لیے اس
قطعی طاقت پر دونوں عالم کی ایک عارضی طاقت (جس کو وہ ثابت کرتے ہیں) اور انسانی فعل کی آ
(جس سے وہ روانہ ہوئے اور جس سے وہ بہ ہیئت مجموعی دست بردار نہیں ہوسکتے) کی قربانی نہیں چڑ
سایہ اور صور کی یہ دنیا جیسا کہ وہ اسے بتاتے ہیں خدا کے لیے غائب ہوجاتی ہے۔

تیسرا سوال جس کے ماتحت غزالی خود کو فلاسفہ سے علٰحدہ کر لیتے ہیں فلسفیانہ دلچسپی کی چیز
نہیں۔ یہ حشر اجساد کے متعلق ہے، فلاسفہ کا نظریہ ہے کہ صرف روح غیر فانی ہے، خواہ بحیثیت انفرادی
یا عالمِ ارواح کے جزو کی حیثیت سے جسم فنا پذیر شئے ہے۔ اس ثنویت کے خلاف جو نظری اعتبار
زاہدانہ اخلاق کی طرف رہنمائی کرتی ہے، لیکن عملی حیثیت سے آسانی کے ساتھ آزادہ روی میں تبد
ہوسکتی ہے، غزالی کے مذہبی اور اخلاقی احساس نے بغاوت کی۔

حشر کے امکان سے انکار نہیں ہوسکتا، کیونکہ روح کا جدید جسمانی ڈھانچہ سے دوبارہ علاقہ اس
قدر تعجب انگیز نہیں جس طرح خاکی جسم کے ساتھ اس کا پہلا اتصال تعجب خیز ہے۔ جس کو فلاسفہ بھی ما
ہیں، یقیناً قیامت کے دن ہر روح ایک جدید جسم جو اس کے موافق ہوگا حاصل کرلیگی، لیکن بہرحال
کا اصلی جوہر اس کی روح ہے۔ اس سے غرض نہیں کہ کونسا مادہ ہے جس سے اس کا یہ روحانی جسم بنا ہے

اِن آخری نظریات سے بھی واضح ہے کہ امام غزالی کی الٰہیات (دینیات) فلسفیانہ خیال سے
بلا اثر پذیر ہوئے نہ رہی، مغربی کلیسا کے علمبرداروں کی طرح اُنہوں نے مسلمانانِ مغرب کے نزدیک شا
یا غیر شعوری طور پر فلسفہ سے بہت کچھ حاصل کیا، اور یہی وجہ ہے کہ بہت زمانہ تک ان کی دینیات
ایک کفر نواز بدعت سمجھی جاتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ذاتِ باری، عالم اور روح انسانی کے متعلق آ
کی تعلیم میں بہتیرے عناصر ایسے ہیں جو اسلام کی قدیم ترین ہیئت کے لیے غیر مانوس ہیں۔ یہ نتیجہ ہے اس
امر کا کہ کچھ تو مسیحی اور یہودی مصنفین کے ذریعہ اور کچھ متاخرین مسلمان مصنفون کی وساطت سے امام غزا

سفہ یونان کا اثر پڑا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اللہ رب العالمین محمدؐ کا خدا امام غزالی کے نزدیک ایک زندہ شخصیت ہے، لیکن پھر بھی جس طرح سیدھے سادہ دین یا غیر معتزلی عقیدہ کے نزدیک اس کی شکل انسانی ہے، امام غزالی کے نزدیک اللہ کی وہ حیثیت نہیں، اس کی معرفت یا علم حاصل کرنے کے لیے سب سے متیقن ذریعہ یہ ہے کہ اس کی مخلوقات کے ساتھ جتنے عرض منسوب کیے جاتے ہیں ان تمام صفات سے اس کی ذات منزہ سمجھی جائے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ صفات سے عاری ہے، اجتماعِ صفات اس کی وحدانیت میں مخل نہیں، عالم جسمانی میں اس کی نظیریں موجود ہیں، ایک ہی شے بہ یک وقت سیاہ وسفید نہیں ہو سکتی، لیکن سرد و خشک ہو سکتی ہے، اگر خدا کی ذات کے ساتھ انسانی صفات منسوب کی جاتے ہیں تو ان کو دوسرے بلند تر معنی میں سمجھنا چاہیے، کیونکہ وہ بالکل خالص ذات ہے علیم و خبیر اور قادر مطلق ہونے کے علاوہ، وہ خیر محض اور ہر جگہ موجود ہے، اس وجود محض کے ذریعہ دنیا اور آخرت عالم صورت کی بہ نسبت قریب تر ہو جاتے ہیں۔

خدا کا تخیل اس طرح سے روحانی بن جاتا ہے، لیکن حشر و آخرت موجودہ زندگی کی بہ نسبت اپنی خصوصیت کے اعتبار سے زیادہ روحانی ہیں۔ یہ تخیل فلسفۂ عرفان (Gnostic philosaphy) کی تعلیم سے مستفاد ہے، جہاں تین یا چار عالموں کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ یہ سارے عالم یکے بعد دیگرے واقع ہیں۔ انسانوں کا پہلا عالم ناسوت یا عالمِ حسّی ہے، دوسرا عالمِ ملکوت ہے جس سے ہماری روح کا تعلق ہے۔ تیسرا ملاءِ اعلیٰ ہے اور چوتھا خود ذاتِ باری ہے، جو پاک ترین نور اور مکمل ترین روح کا منبع ہے، پاک اور منور روح عالمِ ناسوت سے آسمانوں سے گذر کر اوپر کی طرف صعود کرتی ہے، یہاں تک خدا کے روبرو پہنچ جاتی ہے، چونکہ یہ بالطبع ملکوتی ہے۔

ارواح کے مختلف مدارج اور عالم کی طرح انسان باہم مختلف ہیں، جس انسان کی طبیعت ظواہر کے درجہ سے اوپر نہیں ہے، اس کو قرآن اور حدیث پر قانع ہو جانا چاہیے۔ اس کو قانون کی لفظی حد سے

بالاتر نہیں جانا چاہیے، فرض کی اہمیت اس کے لیے زندگی کا جزو لازم ہے۔ فلسفہ اس کے لیے ایک خطرناک زہر ہے۔ جو تیرنا نہیں جانتا اس کو سمندر میں کودنا نہیں چاہیے۔

پھر بھی دنیا میں ایسے آدمی ہیں جو تیرنا سیکھنے کے لیے پانی میں اُترتے ہیں۔ وہ علم میں اپنے ایمان کو ترقی دینا چاہتے ہیں لیکن اس رفتار میں وہ شک و ارتیاب اور کفر و الحاد کا شکار ہو جاتے ہیں اقبال صاحب کی رائے ہے کہ ان کے لیے اس کا مفید علاج یہ ہے کہ فلسفہ کے خلاف کلام و مناظرہ کا مطالعہ کریں۔

جو لوگ بلا کاوش اپنے اندر ایک باطنی اور روحانی تجلی کے ذریعہ عالم روحانی کے حق و صداقت کا مشاہدہ کرتے ہیں، وہ انسانی کمال کی بلند ترین سطح پر پہنچے ہوئے ہیں، یہ لوگ انبیا اور پاک نفس صوفیہ ہیں جن میں خود امام غزالی کا بھی شمار ہو سکتا ہے۔ وہ لوگ شئے میں خدا کا، صرف خدا کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ یہ ذاتِ باری ان کو فطرت میں نظر آتی ہے، اور ان کی خود روح کی زندگی میں بھی، لیکن وہ اس کو اچھی طرح سے روح کے اندر دیکھتے ہیں ـــــ گو یہ الوہی شئے نہیں لیکن الوہیت سے کم از کم ایک شبہ رکھتی ہے۔ اب ہر خارجی چیز کیسی متغیر نظر آتی ہے؟ جو چیز ہماری ذات سے خارج میں اپنا وجود رکھتی تھی، روح کی متاع اور حال بنجاتی ہے۔ یہ روح ذات باری سے اپنے وصل کے شعور میں بلند ترین منزل تک پہنچ جاتی ہے تمام اشیاء اب عشق میں ایک ہو جاتی ہیں، خدا کی حقیقی بندگی یہ ہے کہ اُس کی عقوبت سے ڈرے اور ثواب کی اُمید رکھے اس طور سے روح کے اندر محبتِ الٰہی جاگزیں ہو جائے، خدا کا کامل بندہ صبر و شکر کی سطح سے بلند رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ اس عالم میں بھی بہجتِ قلب کے ساتھ خدا کی حمد کرتا ہے۔

اوپر جو کچھ کہا گیا اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان بالیقین کے تین درجے ہیں۔

منطقین اور فلاسفہ کے برخلاف امام غزالی ہر جگہ تجربہ پر زور دیتے ہیں، سابق الذکر اپنے عالمگیر تصوّرات کے ساتھ مسئلۂ کثرت میں جو اس عالم سے وابستہ ہے انصاف برتنے میں ناکامیاب رہے، اشیا

...نی صفات کا علم مثال کے لیے کواکب کی تعداد ہی کو لے لیجیے، ہم تجربہ ہی کے ذریعہ حاصل کرسکتے ہیں نہ کہ ...ردات کے ذریعہ، اسی طرح یہ تصورات ہماری باطنی ہستی بلندی اور گہرائی کا بھی تعین نہیں کرسکتے، ایک ...لی ...وجدان کے ذریعہ جو علم رکھتا ہے وہ علماء کی رسائیِ ذہن سے بالاتر ہے، علم کی اس بلندی تک مختصر تعداد ...لوگ پہنچتے ہیں، یہاں وہ انبیاء اور ہر زمانہ کے پیغمبروں سے ملتے ہیں، اس لیے جو درجیں اس سطح ...فروتر ہیں اُن کا فرض ہے کہ ان کی پیروی کرنے میں سعی کریں۔

## میک ڈاؤگل کی زندگی کے حالات اور اُسکی تصنیفات

ولیم میک ڈاؤگل (ایم۔ بی) نے ۱۹۱۲ء میں ایف، آر ایس کی ڈگری حاصل کی، ۱۹۲۰ء سے ...ارڈ یونیورسٹی میں نفسیات کا پروفیسر رہے، پہلے وہ جامعہ آکسفورڈ میں فلسفہ ذہنیہ کا ریڈر، اور کارپس ...ن کالج کا رفیق تھا۔ ۱۸۷۱ء میں پیدا ہوا "این" سے شادی کی، اس کے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہوئی، ...طور پر اُس نے اُدِنس سینٹ طامس کے ہسپتال واقع لندن میں تعلیم پائی ۱۸۹۸ء میں وہ کیمبرج کے ...ٹ جان کالج میں رفیق تھا، ۱۹۰۲ء میں لندن کے یونیورسٹی کالج میں ریڈر رہا، ۱۹۱۵ء میں اس ...آر اے ایم سی کا خطاب مِلا۔

۱۹۰۸ء میں اس کی معرکۃ الآرا کتاب "مقدمہ نفسیات اجتماع" شائع ہوئی، ۱۹۱۱ء میں "جسم و ...ح" ۱۹۱۲ء میں "بورنیو کے وحشی قبائل" ۱۹۲۰ء میں (Group Mind) ۱۹۲۱ء میں ...فلاح وزوال" ۱۹۲۳ء میں "خاکہ نفسیات" اشاعت پذیر ہوئی۔[۱]

---

...کی شہرہ آفاق جین لائبریری (جین سدھانت بھون) میں اثنائے مطالعہ میں میک ڈاؤگل کی کتاب "مقدمہ ...نا اجتماع" کا ایک نسخہ میری نظر سے گزرا یہ کتاب مجھے بہت پسند آئی اور میں نے لندن کے ایک تاجر سے اس کا ...نسخہ منگایا، خوش قسمتی سے تاجر نے اس کتاب کا جدید ترین بائیسواں ایڈیشن بھیج دیا۔ کتاب کی اہمیت کا اندازہ ...میرا مصمم ارادہ ہوا کہ بعض حصّوں کا ترجمہ کرکے "نگار" میں شائع کروں، میں نے مصنف کو ایک خط لکھا اُس وقت وہ ...ڈیو یونیورسٹی ڈرہم (شمالی کارولینا) میں نفسیات کا پروفیسر تھا۔ ۲۰۔ فروری ۱۹۳۶ء کو ان کا ایک خط آیا۔ (بقیہ بر صفحہ ۲۵۸)

میک ڈاوگل کی معروف عالم کتاب "مقدمہ فلسفہ اجتماع" کا بائیسواں اڈیشن میرے پیش نظر ہے
یہ کتاب ایک مقدمہ، پندرہ ابواب اور سات ضمنی ابواب پر مشتمل ہے، کتاب کی دو فصلیں ہیں۔ پہلی فصل میں
انسان کے ذہنی خصائص پر بحث کی گئی ہے، اور دوسرے حصہ میں ان خصائص کے امیال وعواطف
روشنی ڈالی گئی ہے، جو حیات اجتماعی میں ظہور پذیر ہوتے ہیں، مصنف ابھی زندہ ہے اور کتاب کے ہر اڈیشن
میں وہ ایک ضمنی باب کا اضافہ کرتا جاتا ہے۔

میک ڈاوگل کا اہم ترین نفسیاتی اکتشاف جس نے اس کو علمائے نفسیات میں ایک خاص
وامتیاز کا مالک بنا دیا ہے، جبلت کے مخصوص اقسام کے متعلق ہے۔ یہ بحث اس کی کتاب کے تیسرے
باب میں پائی جاتی ہے اور یہی گویا کتاب کی جان ہے، میک ڈاوگل کی تحقیق یہ ہے کہ ہر مخصوص جبلت
کے لیے ضروری ہے کہ بعض قسم کی جذباتی تحریک کی تخلیق کرے جو اس جبلت ہی کے لیے مخصوص اور ممتاز
ہیں۔ اسی قسم کے جذبات کو جو جبلت کے اثر سے پیدا ہوتے ہیں، وہ "جذبات اساسی" کہتا ہے، اب
ان جذبات کی اس نے فہرست دی ہے" جبلت گریز اور جذبۂ خوف (۲) جبلت رد اور جذبۂ کراہیت
(۳) جبلت مذرت پسندی اور جذبۂ تعجب (۴) جبلت مجادلہ اور جذبۂ غضب (۵) احساس کمتری او
جذبۂ سپردگی (۶) احساس برتری اور جذبۂ پندار (۷) جبلت ابوت و امومت اور جذبۂ لطیف۔

میک ڈاوگل نے بعض چھوٹی چھوٹی اور جبلتوں کی تعداد بھی گنائی ہے، جن کے زیر اثر ایسے
جذباتی رجحان پیدا ہوتے ہیں، جن کی کوئی خاص تعریف نہیں ہو سکتی، مثلاً جبلت جنسی، جبلت اجتما
جبلت حصول، جبلت تعمیر، جبلت خندہ وغیرہ۔

ریبو نے اپنی کتاب کے اندر انسان کے سارے امیال وعواطف کو لذت والم کی پیدا

(بقیہ صفحہ ۲۵۷) جس میں انہوں نے میرے خیال پر اظہار بشاشت کیا اور ترجمۂ اقتباس کے سلسلہ میں بعض ہدایتیں
اس کے بعد اگست ۱۹۳۶ء میں انہوں نے میری طلب پر اپنی ایک تصویر بھیجدی۔ اس دوران میں مجھے پتہ چلا کہ جا
لیہ سے اس کا ایک ترجمہ شائع ہو چکا جو ابھی تک میری نظر سے نہیں گذرا، لہذا میں نے مناسب سمجھا کہ یہ کام بند کر دیا جائے

ہے۔ اُس کے فلسفہ کی بنیاد ہی غلط اصول پر قائم ہے۔ ربیو خوشی اور غم کو جذبات اساسی تصور کرتا ہے بخلاف اس کے بقول میک ڈاؤگل یہ جذبات تبعی یا ثانوی ہیں اس نے اس مسئلہ پر اپنی کتاب (ضمیمہ ۳) میں مستقل بحث کی ہے[19] اور بتایا ہے کہ خوشی و غم جذبات اساسی نہیں ہیں، بلکہ جذبات تبعی ہیں، اسی طرح اس نے اپنی کتاب کے باب "اصول عمل" میں اس غلط فہمی کا مکمل ازالہ کیا ہے کہ جذبات لذت و الم کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

میک ڈاؤگل نے نفسیات کے بہت سے اسکولوں پر جرح و تعدیل کی ہے، اس کی بحث نفسیات مذہب سے متعلق ہے بڑی دلچسپ ہے۔

## جذبۂ خوف

میک ڈاؤگل لکھتا ہے کہ خطرے سے گریز کرنا تقریباً تمام انواع حیوانی کی بقا کے لیے لازمی ہے، اور اکثر بڑے حیوانوں میں یہ جبلت قوی ترین ہوتی ہے، وہ جذبہ جو اسی جبلت سے وابستہ ہے، اس کو خوف کہتے ہیں۔ دہشت جو اس جذبہ کی شدید ترین درجہ کی چیز ہے، اس قدر اعصابی برہمی پیدا کر دیتی ہے کہ اس جبلت کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ غشی یا موت طاری ہو جاتی ہے۔ دماغی امراض کی بعض صورتوں میں مریض کی آشفتگی لازماً مبنی ہوتی ہے، اس جبلت کی غیر معمولی تحریک اور اس کے فعل کی کثرت اور شدت پر مریض برابر خوف میں رہتا ہے وہ ایسے جانور سے کانپنے لگتا ہے جو بالکل غیر مضرت رساں ہو، یا ایسی آواز سے لرزہ براندام ہو جاتا ہے جو غیر معمولی ہو، اور غیر امکانی خطرات سے بچاؤ کے لیے اپنے کو محافظین سے گھرا ہوا رکھتا ہے۔

بہت سے جانوروں میں جبلی گریز کے ساتھ ساتھ چھپنے کی جگہ میں جبلی طور پر فوراً نہاں ہو جانے کا بھی رجحان پایا جاتا ہے، اور اس میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ قدیم انسان میں یہ جبلت دہرا رجحان رکھتی تھی، جب دوڑنے لگتا ہے تو اُس کے خوف میں بھاگنے کے ساتھ ساتھ چھپ جانے کا رجحان بھی پایا جاتا ہے۔

[19] Supplementary chapter III.

اور بڑی عمر کے بہتیرے لوگ جو شب کی تاریکیوں میں بستر سے اپنا سر چھپا کر اجنبی شور یا طوفان و ہنگامہ کی وجہ سے ایک امن کی تلاش کرتے ہیں، اور جو ایسا کرنے میں ایک غیر معقول سا سکون محسوس کرتے ہیں وہ اسی رجحان کی مزاولت کرتے ہیں[1]۔

غالباً یہی دونوں رجحانات (جو جذبۂ خوف سے وابستہ ہیں) کے متضاد خصائص کے مطالعہ کے ذریعہ ہم خوف کے مختلف اصناف، تغیرات اور علامات کا پتہ لگا سکتے ہیں، حرکتِ قلب اور سانس کی آمد شد کا یکایک بند ہو جانا قدم کا رُک جانا نتیجہ ہیں اسی خود کو نہاں کرنے کے تہیج کا، سانس اور نبض کی سرعت اور مجنونانہ جسمانی کشاکش نتیجہ ہیں تہیج گریز گا۔

جذبۂ خوف کی تحریک لازماً یا عموماً خطرہ کے احساس و وقوف کے باعث نہیں ہوا کرتی[2]۔ اس

---

[1] میرے دوست محمد امیر صاحب (نائب ناظر کلکٹری آرہ) اپنے ایک ہمراز قدیم دوست کو "مولانا گوریلا" کہا کرتے ہیں۔ ۱۹۳۴ء میں جب بہار میں زلزلہ آیا تو مولانا گوریلا مکان پر نہ تھے، بلکہ ایک دوسرے محلہ میں رشتہ سے گذر رہے تھے، زمین نے جنبش شروع کی اور ادھر ہمارے "مولانا گوریلا" دوڑے اور دوڑ کر ایک کہنہ مکان میں چھپ گئے، امیر صاحب آج تک مولانا پر ہنسی آتے ہیں، اور اپنے پندار میں مولانا کی بزدلی اور احمقانہ گریز پر استہزاء کرتے ہیں، درانحالیکہ بقول میک ڈاوگل یہ فطرت انسان کا ایک خاصہ ہے۔ ہاں اتنا کہہ سکتے ہیں کہ مولانا نے گوریلا کی مناسبت سے تہذیب حاضر کے دور میں قدیم انسان کو اپنے کو قریب تر دکھایا اور اس کے ساتھ امیر صاحب کی بخشش لقب بھی قابل داد ہے۔ کہ انہوں نے خدا جانے مولانا کے کن امیال و عواطف کا غیر شعوری طور پر نفسیاتی مطالعہ کیا کہ ان کو "مولانا گوریلا" کہنے لگے، کیونکہ گوریلا کا لقب ہمارے مولانا کو اس زلزلہ کے حادثہ سے قبل بخشا جا چکا تھا۔

[2] ہمارے ایک دوست ہیں جن کو اپنی ہمت اور قوت دل پر ناز ہے اور دوسرے احباب کو بھی ان کے ساتھ یہ حسن ظن ہے، لیکن ان کے ساتھ ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ایک روز جبکہ آدھی رات گذر چکی تھی ان کے ایک پڑوسی (عبدالکریم کول مرچنٹ) نے ان کو مدد کے لیے پکارا، یہ صاحب حسبِ دستور گھر سے نکل پڑے اور چوروں کے تعاقب اور تجسس میں ایک میدان میں پہنچے، ابھی کنارہ ہی پر تھے کہ ایک چور نے ایک بڑا سا ڈھیلا پھینک مارا، میرے دوست کا بیان ہے کہ انہوں نے چوروں کو مطلق نہ دیکھا لیکن ان کے پڑوسی نے ایک ہیبتناک چیخ ماری اور لالٹین لیے ہوئے بھاگ نکلے۔ ان کے پیچھے میرے دوست بھی بھاگے اور دہشت میں قدم کے اندر توازن قائم نہ رکھ سکے اور (بقیہ بر صفحہ ۲۶۱)

بوت اس امر سے ہوسکتا ہے کہ بچے اپنے بڑوں کی آغوش میں بھی اپنے دوست کی تفریحی چیخ یا اس کے بھیس بدلنے سے ڈر جاتے ہیں، اور منت وسماجت کرتے ہیں کہ ان کا دوست ایسا نہ کرے بسا اوقات یک بچہ دہشت کے مارے بیہوش ہو جاتا ہے۔ اگر اس کا کوئی ساتھ کھیلنے والا بچہ خوفناک بھیس بدل کر ئے، گو بچہ کو یہ بھی علم ہو کہ یہ اس کا فلاں دوست ہے۔

اس جبلت کے محرکات میں سے جس کے طریق عمل کا سمجھنا دلچسپ ترین اور مشکل ترین امر ہے۔ "غیر مانوس" اور "اجنبی" مظاہر ہیں۔ انسان اور حیوان دونوں ان چیزوں سے خوفزدہ ہو جاتے ہیں، جو بالکل اجنبی اور غایت درجہ غیر مانوس ہوتی ہیں۔ بہ شرطیکہ وہ ان کی توجہ مبذول کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہوں میرے خیال میں اس امر میں شک ہے کہ چاند گرہن نے کبھی کسی حیوان کے اندر خوف

(صفحہ ۲۶۰ کا بقیہ نوٹ) گر پڑے۔ پڑوسی صاحب ایک نزدیک والے مکان کے زنانخانہ میں لالٹین لیے گھس گئے۔ میرے دوست فوراً اُٹھے اور اُنھوں نے حواس جمع کرکے پڑوسی کو اس حرکت پر ملامت کی، اور لالٹین لے کر پھر دو رہ اس مقام پر پہنچے، پڑوسی نے آگے بڑھ کر لالٹین ہمارے دوست کے حوالہ کی اور پھر اُلٹے پاؤں پھرے۔ میرے دوست کو اپنی دہشت اور گر جانے کا بیحد صدمہ رہا کیونکہ وہ اپنے زعم میں خود کو قوی دل و دماغ کا تصور کرتے تھے، اس واقعہ سے ان کے پندار کو سخت ٹھیس لگی، وہ اپنے کو بزدل اور کم ہمت تصور کرنے کے لیے تیار نہ تھے، اور واقعہ اس کے مخالف موجود تھا، میک ڈاؤگل نے پوری طرح اس مسئلہ کی عقدہ کشائی کی ہے، ناگہانی خوفناک چیخ سے بھی انسان دہشت زدہ ہو جاتا ہے، اور اس کا یہ کہنا بھی بالکل صحیح ہے، کہ خطرہ کا وقوف واحساس ہوئے بغیر بھی انسان کے اندر جذبۂ خوف کی تحریک ہو جاتی ہے، اور یہی میرے دوست کے ساتھ ہوا۔ اُنھوں نے چور کی صورت بھی نہ دیکھی محض پڑوسی کی ناگہانی چیخ اور گر پڑنے نے ان کے اندر ایک دہشت انگیز تحریک پیدا کر دی۔ اس سلسلہ میں میک ڈاؤگل کا خود ذاتی واقعہ بھی قابل غور ہے، جو اُنھوں نے "ہمدردی" کے سلسلہ میں بہ طور حاشیہ لکھا ہے، فرماتے ہیں کہ: "ایک شب تاریک میں ایک بچی کو بازو میں لے کر میں دریچے سے باہر آسمان کا نظارہ کر رہا تھا، بدلی چھائی ہوئی تھی، یکایک بجلی چمکی، اور رعد کی کڑک سے بچی بے انتہا خوف زدہ ہو کر چیخ اُٹھی، اس چیخ سے میرے دل میں ایک لمحہ کے لیے ایسا خوفناک اثر پیدا ہوا کہ جہنم میں جلنے سے کسی طرح کم نہیں، جب میں تنہا رہتا ہوں تو رعد سے مجھے مطلق تشویش نہیں ہوتی" اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، ایک یہ کہ کسی دوسرے فرد کے اظہار جذبہ پر ہمدردی کے ماتحت فوری جبلی رد عمل، دوسرے پر زور چیخ و پکار کا محرک خوف ہونا، میک ڈاؤگل کے اس نفسیاتی انکشاف نے میرے دوست کی تشفی کر دی۔[۱۲]

(مقدمہ نفسیات اجتماع ص ۸۱)

کی تحریک کی ہو، یہ اس لیے کہ چاند حیوان کی توجہ کی چیز نہیں لیکن وحشی انسان کے لیے ہمیشہ یہ خوف کا موجب رہا ہے۔ رومانیس نے جس مشہور کتے کا حال لکھا ہے کہ وہ ایک غیر مرئی دھاگے کی ذریعہ کسی شے کی نقل وحرکت سے دہشت زدہ ہوگیا تھا، اس امر کی شہادت پیش کرتا ہے کہ اجنبی چیزیں حیوانوں کے اندر خوف کی تحریک کرتی ہیں، اس سلسلہ میں ذیل کا واقعہ سبق آموز ہے، پانچ سال کی ایک دلیر لڑکی دن کی روشنی میں ایک کمرہ کے اندر تنہا بیٹھی تھی، وہ یکایک دہشت سے چیخ اُٹھی، باپ کمرہ کے اندر دوڑ کر آیا، تو اُس نے بتایا کہ میں نے کسی چیز کو حرکت کرتے دیکھا، کمرہ کے ایک گوشہ میں ایک چوہے کا پتہ معلوم ہوا، اور اس اکتشاف نے فوراً معاملہ کو نوعیت واضح کردی، اور بچی کے دل سے دہشت زائل ہوگئی، چونکہ وہ چوہوں سے مالوف تھی۔ یہی جبلت انسانوں کے اندر نوع بہ نوع صورت میں جلوہ گر اور ذہنی اثر کے ماتحت ہوتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ وہ پُراسرار، غیر مانوس اور مابعد الطبعی سے خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ اور اسی خوف نے ہیبت وعظمت کے جذبات تبعی میں داخل ہوکر تمام مذاہب پر اثر آفرینی کی۔ خوف کی خصوصیت یہ ہے (گو اس کے اندر گریز کا تہیج ہو یا خود کو مخفی کرنے کا) کہ وہ دماغ کے تمام دوسرے حرکت وعمل کو فنا کر دیتا ہے، اور توجہ صرف اس شے پر مرکوز ہو جاتی ہے، جس نے اس جذبہ کی تحریک کی، غالباً توجہ کی مرکزیت اور جذبہ کی اس شدت کا نتیجہ ہے کہ اس جبلت کی تحریک دماغ پر گہرا اور دیرپا اثر ڈالتی ہے۔

غضب کا ایک شعلہ، رحم کی ایک موج اور جذبہ لطیف کی ایک نگاہ ندرت پسندی کا ایک تہیج دماغ کی حرکت وعمل میں زور یا تنوع اور تعاون پیدا کرسکتا ہے، دماغ پر ان کی کارفرمائیاں ہوسکتی تھیں لیکن یہ جذبات زیادہ دیرپا نہیں ثابت ہوسکتے، لیکن خوف کا جذبہ جب ایک مرتبہ ابھر جاتا ہے تو پھر دماغ پر مسلط ہو جاتا ہے۔ یہ خواب اور بیداری دونوں عالم میں اپنے ساتھ بھیانک تاثر کی یاد دلاتا ہے، اس طور سے یہ جذبہ اعمال حاضر اور اعمال مستقبل پر بڑی حد تک اثر انداز ہوسکتا ہے۔